غ ا ل ب

س ے

ج ا ل ب

ت ک

غالب سے جالب تک

یوسف مثالی

غالب سے جالب تک

ثنا پبلیکیشنز
غزنی سٹریٹ ۰ اردو بازار ۰ لاہور

مشتاق بُک کارنر - اَلفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور

محمد اسلم صدیقی

انتساب

اپنے پیارے بھائی جان

نیاز محمد مرحوم

کے نام ——

مُرتّبین

طارق

خالد

فیصل

غالبؔ

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے،

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر!
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!

اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بِن آئے نہ بنے!
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے!

بوجھ وہ سر سے گِرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عِشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اسداللہ غالب

آہ کو چاہیئے اک عُمر اثر ہونے تک!
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب!
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ذوق

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی، کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے، سو نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے، ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

✪

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے، وہ ہی ہو!
دانش تری، نہ کچھ مری دانشوری چلے!

مومنؔ

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو برا لگا!
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آتش

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُو برُو کرتے
ہم اور بُلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیامِ بَر نہ مُیسّر ہُوا تو خُوب ہُوا!
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

لٹاتے دولتِ دُنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغرِ مے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ ہم نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم!
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

بیاضِ گردنِ جاناں کو صبح کہتے جو ہم
ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے!

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا رفو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتشؔ
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

بہادر شاہ ظفؔر

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی !
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

چشمِ قاتل میری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

ان کی آنکھوں نے خُدا جانے کیا کیا جادُو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

⁂

پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی!

داغ

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہی منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا؟

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

ترے وعدے پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

یہ وہ دردِ دل نہیں ہے کہ ہو چارہ ساز کوئی
اگر ایک بار مٹتا تو ہزار بار ہوتا !

نہ مزا ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں
کوئی غیر غیر ہوتا، کوئی یار یار ہوتا !

تمہیں ناز ہو نہ کیوں کر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی تو یہ افتخار ہوتا

داغ

کیا تھا جُرم وفا لذّتِ سزا کے لیے !
ستم کے لُطف اُٹھائے مزے جفا کیلئے

خُدا کرے نہ کسی کا اُمیدوارِ وصال !
دُعائیں مانگتے ہیں ترکِ مدّعا کے لیے !

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منّتوں سے کہیں چُپ رہو خُدا کے لیے

شریر آنکھ ، نگہ بے قرار ، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لیے

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی!
عجیب چیز ہے یہ طولِ مُدعا کے لیے!

✪

غرض جہاں سے کیا اے فلک مرے ہوتے
غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے!

✪

ترے کہے سے اے داغؔ ہم چھوڑ دیں گے عشق
خُدا کے واسطے دیتا ہے کیوں خُدا کے لیے

امیرؔ مینائی

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

نہ گُل ہیں، نہ غنچے، نہ بُوٹے، نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

ہر اک دل پہ ہیں داغ ناکامیوں کے
نشاں دے گیا بے نشاں کیسے کیسے

بہار آکے قدرت کے گلشن میں دیکھو
کھلاتا ہے گُل باغباں کیسے کیسے

امیرؔ اب مدینے کو تو بھی رواں ہو!
چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے!

حالؔی

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے!
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا!
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے!

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ!
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رُوسیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور مہماں رہے!

✪

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام!
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

✪

حالیؔ کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کُچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

حالؔی

ہے جُستجو کہ خُوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں!
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر!
تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اِک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عمر
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی !
دِل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں
حالیؔ نشاطِ نغمہ و مَے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

✪

پنڈت برج نرائن چکبست

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیّت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب!
موت کیا ہے، انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

جس طرح خم کسی جام کا ٹکڑہ نکلے
یُونہی گردوں سے مہِ نو کا نمایاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا، پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سروساماں ہونا

دفترِ حسن پہ ، مہرِ یدِ قدرت سمجھو !
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

✪

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرّۂ دستارِ غریباں ہونا

✪

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لیے چاک گریباں ہونا

شاد

ڈھونڈھوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبّت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم!

ہے دل میں تڑپتے جی بھر کر پر ضعف نے مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم

اے شوق پتا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھُلا !
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے !
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم !

فانی بدایونی

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا!
مِل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دُھواں دل سے اٹھا

پھر تو مضرابِ جنوں، سازِ انا لیلیٰ چھیڑ
ہائے وہ شور "انا القیس" کہ محمل سے اٹھا

اختیار اِک ادا تھی میری مجبوری کی
لطفِ سعیٔ عمل، اس مطلبِ حاصل سے اٹھا

عمرِ اُمید کے دو دن بھی گراں تھے ظالم
بارِ فردا، نہ ترے وعدۂ باطل سے اٹھا

خبرِ قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
اِک بگولہ بھی نہ خاکِ رہِ منزل سے اٹھا

✪

ہوش جب تک ہے گلا گھونٹ کے مر جانے کا
دمِ شمشیر کا احساس ترے بسمل سے اٹھا

✪

موت و ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آسان نہ تھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

فانی

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا!

✪

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھُلتا ہے
یا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا!

✪

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیئے!
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدّت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اکبر الٰہ آبادی

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں!
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے لچا اے ہوش ذرا سوجا
مہمانِ نظر اس دم ایک برق تجلّی ہے

✪

واں دِل میں کہ صدمے دو یاں دل میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دِل ہے میرا بھی عجب جی ہے

✪

سُورج میں لگے دھبّہ فطرت کے کرشمے ہیں!
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے!

ریاض خیرآبادی

جفائیں نام نکالو نہ آسماں کی طرح
کھلیں گی لاکھ زبانیں مری زباں کی طرح

یہ کس کی سایۂ دیوار نے مجھے پیسا!
یہ کون ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح

رہِ حیات کٹی اس طرح کہ اٹھ اٹھ کر
میں بیٹھ بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں
وہ لوگ جن سے تعلق تھا جسم و جاں کی طرح

مجھے شباب نے مارا بلائے جاں ہو کر
بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

✪

تری اٹھان ترقی کرے قیامت کی !
ترا شباب بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح

✪

ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح !

اصغر گونڈوی

مستی میں فروغِ رخ جاناں نہیں دیکھا
سنتے ہیں بہار آئی ، گلستاں نہیں دیکھا

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پہ تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا!

روداد چمن سنتا ہوں، اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

✪

✪

✪

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں، یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

علامہ اقبالؒ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر!
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر!

عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرُو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

✪
✪

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

✪
✪

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل!
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

علامہ اقبالؒ

ظاہر کی آنکھ سے نہ تمنّا کرے کوئی !
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہُوا، لبِ گویا، پیامِ موت
اب کیا کسی کے عِشق کا دعوی کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق کو آنکھوں کو بند کر !
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی!

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

✪

عذر آفرینِ جرم محبّت ہے حُسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

✪

نظّارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

✪

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنّائے شوق کے
دو چار دن جو میری تمنّا کرے کوئی!

✪

جوشؔ ملیح آبادی

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا!

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا!

دل کو چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا!
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

اب میں سو جان سے اس طرزِ تکلّم کے نثار
پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا برباد!
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

••

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب کلی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

••

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

جوشؔ

قدم انسان کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح
وہ آتے ہیں تو چہرہ پہ تغیّر آ ہی جاتا ہے!
سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

چراغ حسن حسرت

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کِیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دُعا ہوتا

اِک عشق کا غم آفت اور اُس پہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا!

اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کِیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سُنا ہوتا

چراغ حسن حسرت

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں!
زُلف کی رخسار کی باتیں کریں!

زُلفِ عنبر بار کے قصّے سنائیں
طرّۂ طرّار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
رازِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں!

•
•
•

دمِ آخر وہ آ گئے حسرتؔ
موت سے اب کوئی بہانہ کریں

اختر شیرانی

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہُوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہُوا

مدّت ہوئی تغافلِ سلمیٰ ہے برقرار
اللہ میری زود پشیماں کو کیا ہُوا !

اللہ رے بے کسی کہ عدو بھی خفا ہیں اب
دَورِ سپہر و گردشِ دوراں کو کیا ہوا

کس نے مسل کے رکھ دیا برگِ شباب کو
اُف ، آہ ! میری نرگسِ حیراں کو کیا ہوا

✪
✪

ہیں ! آنسوؤں سے پیار کی نگہت کدھر گئی
سلمٰی ! یہ تیری چشمِ پریشاں کو کیا ہوا

✪
✪

پھر مرقدِ محبّتِ اختؔر تڑپ اُٹھا !
یارب ! یہ آج گورِ غریباں کو کیا ہوا

اختر شیرانی

اے عشق ہمیں برباد نہ کر، ہم بھولوں ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

☆ ☆

جس دن سے ملے ہیں، دونوں کا سب چین گیا، آرام گیا
چہروں سے بہارِ صبح گئی، آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگین نہ بنا، ناشاد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

☆ ☆

وہ راز ہے یہ غم، آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں!
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں، آ جائے کوئی خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا، دل کو یہاں بھا جائے کوئی خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

✪

دنیا کا تماشہ دیکھ لیا، غمگین سی ہے، بیتاب سی ہے،
امید یہاں اِک وہم سی ہے، تسکین یہاں اِک خواب سی ہے،
دُنیا میں خوشی کا نام نہیں، دنیا میں خوشی نایاب سی ہے،
دُنیا میں خوشی کو یاد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

تاجور نجیب آبادی

محبت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے!
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

٭

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُنکی
یہ دلداری حسابِ دوستاں در دل نہ بن جائے

٭

کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبّت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

٭

یہ متوالی نظر، یہ بادہ بے جام، ارے توبہ
کسی پر بے نبی اے ساقیِ محفل نہ بن جائے

●
●

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

●
●

کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغناء محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

مولانا حسرت موہانی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے!
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونہ دفعتہً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

تجھ کو تنہا جب کبھی پانا ، تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے ، راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

دوپہر کی دُھوپ میں میرے بلانے کیلئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کی باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اُڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا، تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدّتیں گزریں، پر اب تک وہ ٹھکانہ یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گُدگدانا یاد ہے

باوجود ادعائے اتّقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

میراجی

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں!
کہتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گزری اُن کے سہارے گذری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا اعلان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

پنڈت ہری چند اختؔر

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خُدا ہونے کا وقت آیا

اُنھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کے سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلّم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

خدا جانے یہ ہے اوجِ یقیں یا پستیٔ ہمت
خدا سے کہہ رہا ہے نا خدا ہونے کا وقت آیا

٭٭٭

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

بہزاد لکھنوی

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

آتا ہے جو طوفاں آنے دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے
مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آجائے

اے دل کی خلش چل یونہی سہی چلتا تو ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب سامنے منزل آجائے

اے رہبرِ کامل چلنے کو تیار تو ہوں بس یاد رہے
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

✪

اس عشق میں جان کو کھونا ہے ماتم کرنا ہے رونا ہے!
میں جانتا ہوں جو ہونا ہے پر کیا کروں جب دل آ جائے

✪

ہاں یاد مجھے تم کر لینا آواز مجھے تم دے لینا
اس راہِ محبّت میں کوئی درپیش جو مشکل آ جائے

عابد علی عابد

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بیچارے خود ہیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

جن گلیوں میں ہم نے سکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
ان گلیوں میں بے کل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں!

روپ سروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھور اندھیرے پھرتے ہیں

جن کے شام برن سایوں میں میرا من سستایا تھا
اب تک میری نظروں میں وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں

✪

کوئی ہمیں بھی تو سمجھا دو، ان پر دل کیوں ریجھ گیا!
تیکھی چِتوَن، بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ہیں!

✪

اس نگری کے باغ اور بن کی یارو لیلا نیاری ہے
اس میں پنچھی سر پہ اٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں

✪

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے بھی ہو جی لیتے ہیں
عابدؔ ہم دیوانے ہیں جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

✪

احسان دانش

جو اہلِ عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے چلن خواب ہوتے جاتے ہیں

نشے کی جانچ میں پیرِ مغاں کے منصوبے
جواریوں کے حسیں خواب ہوتے جاتے ہیں

وہ ذرّے جن پہ نہ سورج کی پڑ سکیں کرنیں
تمام کرمکِ شب تاب ہوتے جاتے ہیں

ابھی تو صاحبِ ظرف و ضمیر ہیں کچھ لوگ
مگر یہ لوگ بھی کمیاب ہوتے جاتے ہیں

✪
✪

تھا جس کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں

✪
✪

گزر رہے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
کتابِ وقت کا اک باب ہوتے جاتے ہیں

جگر مرادآبادی

دِل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں!

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں!

مُجھ سے ادا ہوا ہے جگرؔ جستجو کا حق!
ہر ذرّے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

جگرؔ

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا!
دل کچھ اُس صُورت سے تڑپا اُنکو پیار آ ہی گیا

✪

ہائے یہ حُسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بُو!
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا!

✪

اِسطرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

✪

جان دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

✪

شکیب

یادیں ہیں اپنے شہر کی، اہلِ سفر کے ساتھ
صحرا میں لوگ آئے ہیں دیوار و در کے ساتھ

منظر کو دیکھ کر پسِ منظر بھی دیکھیئے
بستی نئی بسی ہے پُرانے کھنڈر کے ساتھ

سائے میں جان پڑ گئی دیکھا جو غور سے
مخصوص یہ کمال ہے اہلِ نظر کے ساتھ

اک دن ملا تھا بام پہ سُورج کہیں جسے !
اُلجھے ہیں اب بھی دُھوپ کے ڈورے لگر کے ساتھ

✪

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہُوئی ہے شجر کے ساتھ

✪

اس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ

✪

میری طرح یہ صُبح بھی فنکار ہے شکیبؔ
لکھتی ہے آسماں پہ غزل، آبِ زر کے ساتھ

✪

مجروح سلطانپوری

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح!

وہ تو کہیں ہیں اور جگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہہ یار کی طرح!

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یُونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

✪

اب جا کے کھُلا کچھ ہنر ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

✪

مجرُوحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

معین احسن جذبی

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت وسالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دُنیا دُنیا کون کرے

فراق گورکھپوری

شامِ غم کچھ اُس نگاہِ ناز کی باتیں کرو!
بے خودی بڑھتی چلی ہے، راز کی باتیں کرو!

نکہتِ زلف پریشاں داستانِ شامِ غم!
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو!

یہ سکوتِ یاس، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا!
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

یہ رگِ دل وجد میں آتی رہے، دُکھتی رہے
یُونہی اُس کے جا و بیجا ناز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اسی عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو!

عدؔم

مدت ہوئی ہے درد کا درماں کیے ہوئے
احساسِ زندگی کو گلستاں کیے ہوئے

اے کاش اک کلی تو خوشی کی چٹک پڑے
تکلیفِ صد تبسّم گریاں کیے ہوئے

شاید کسی صنم کی خدائی تڑپ اُٹھے
دل جل گیا اطاعتِ یزداں کیے ہوئے

رُخ سے نقاب اُٹھا کہ بڑی دیر ہو گئی
ماحول کو تلاوتِ قرآں کیے ہوئے

✪

اک لمحہ تو ملا مِرے ہونٹوں سے آپ ہونٹ
شیرینیٔ دہن کو رگِ جاں کیے ہوئے

✪

ساقی! خرابیٔ دِلِ مضطر کا کیا علاج
مدّت ہوئی ہے دل کو بیاباں کیے ہوئے

✪

پہنچا ہُوا ہوں پھر غمِ ہستی کے ماورا
دل کو سپردِ گیسوئے جاناں کیے ہوئے

✪

بیٹھا ہوا ہوں پھر کسی جانِ بہار کو
تنہائیٔ خیال میں مہماں کیے ہوئے

✪

پھر جا رہا ہوں سوئے خرابات اے عدمؔ
توبہ کی گمرہی کو مسلماں کیے ہوئے

مزدور عورتیں

تڑکے تڑکے کر کے گھر کے سب مکمل کام کاج
ہوں ذرا بیمار بھی تو بے تکلّف ، بے علاج

مُستعد ہو کر ٹھکانوں سے نکل آتی ہیں یہ
ڈٹ کے کاروبار میں مصرُوف ہو جاتی ہیں یہ

بنتی سڑکیں ہوں کہ کچی خشت گاہوں کے نگر
رونقیں سب کی ہیں ان کے بازوؤں پر منحصر

چلچلاتی دُھوپ میں چلتی مشینوں کی طرح
منہمک رہتی ہیں گوہر آفرینوں کی طرح

کام سے فرصت کے دن اشیائے خانہ کی خراش
مختلف راہوں میں رکھتی ہے انہیں گرمِ تلاش

وقت کو تقسیم کرکے حسبِ حالات و امور
برملا رکھتی ہیں، اپنی ہر ضرورت کا شعور

اپنی محنت کی کمائی خرچ کرنے کی گھڑی
مسکراہٹ سے یہ بن جاتی ہیں بالکل پھلجھڑی

اپنی خوشیاں سادگی سے تولتی رہتی ہیں یہ
بے ریا لہجے میں ہنستی بولتی رہتی ہیں یہ!

کھانے پینے کی سب اشیا گھر میں بھر لینے کے بعد
سات دن جینے کا بندوبست کر لینے کے بعد

لکڑیاں چنتی ہیں ایندھن کے لیے دیوانہ وار
اُن کے کندھوں کو جھکا سکتا نہیں پیڑوں کا بار

استخواں اُن کے کمانوں کی طرح مضبُوط ہیں
حوصلے پختہ چٹانوں کی طرح مضبُوط ہیں

ان مُعزّز اور جفاکش عورتوں کا کیا جواب
ان کے اعضا سُرخ تانبا ان کے چہرے آفتاب

عورتیں تو یہ نہیں قرآن کی آیات ہیں
کبریا کی قوّتِ تعمیر کے آلات ہیں

انشاؔ

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

پھر ہجر کی لمبی رات یہاں، سنجوگ کی تو بس ایک گھڑی
جو دل میں ہے، لب پر آنے دو، شرمانا کیا، گھبرانا کیا!

اس دل کے دریدہ دامن میں، دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا

شب گزری، چاند بھی ڈوب گیا، زنجیر پڑی دروازے پر
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو، سجنی سے کروگے بہانا کیا

رہتے ہو جو ہم سے دُور بہت، مجبُور ہو تم، مجبُور بہت
ہم سمجھوں کا سمجھانا کیا، ہم بہلوں کا بہلانا کیا!

جب شہر کے لوگ نہ رستہ دیں، کیوں بن میں نہ جا بسرام کریں
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا!

ساغر صدیقی

ہے دُعا یاد مگر حرفِ دُعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

ہم نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہُو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں!

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جُرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں!

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں!

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں!
کیسے تھرّائی چراغوں کی ضیا یاد نہیں!

صرف دُھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا کون ہُوا مُجھ سے خفا یاد نہیں!

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

ساغرؔ صدیقی

انقلابِ وقت

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے
رہزنی ، غارت گری بیداد کی تشہیر ہے
عافیت ہے سر برہنہ آبرو نخچیر ہے
نعرۂ حق و صداقت لائقِ تعزیر ہے
ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

ایک شب اجڑا کسی بابا کی بیٹی کا سہاگ
اُڑ گئی پھولوں کی خوشبو ڈس گئے کلیوں کو ناگ
ظلمتوں میں سو رہے ہیں چاندنی راتوں کے بھاگ
آدمیت ان دنوں اک لاشۂ تقدیر ہے
ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

ایک بیچارے نے دم توڑا اشفاف کے قریب
برق کے جھٹکے سے ٹھنڈا ہوگیا اک بدنصیب
لاریوں کی ٹکروں سے مر گئے کتنے غریب
آج ہر مظلوم کی فریاد بے تاثیر ہے!
ایک یہ بھی انقلاب وقت کی تصویر ہے!

اک محلہ سے کسی کا لاڈلا گم ہوگیا
وائے قسمت ایک بوڑھے کا عصا گم ہوگیا
کارواں سے نغمۂ بانگِ درا گم ہوگیا
درپئے! حلقومِ اصغرؑ حرملہ کا تیر ہے
ایک یہ بھی انقلاب وقت کی تصویر ہے

چھن گئی مزدور کی پونجی بھرے بازار میں!
اور مجرم ہوگئے مفرور فوراً کار میں!
روز چھپتی ہیں بھیانک سرخیاں اخبار میں
دیکھئے! اک خودکشی کی داستاں تحریر ہے
ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

زندگی کرتی ہے جُرموں کی تجارت آج کل
چیختی ہے راہگزاروں پہ شرافت آج کل
علم کے ماتھے پہ ہے داغِ جہالت آج کل
آج بے نام و نشاں اسلاف کی توقیر ہے!
ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے!

ساغرؔ صدیقی

کانچ کی چوڑی سے ارزاں انکی عصمت کا نگیں

جھولیوں میں کوئلے پتھّر کے اور مٹی کے روڑ
گاہے گاہے، زندگی کے بے محل نشے کا توڑ
ٹوٹے پھوٹے آئینوں میں حُسنِ فطرت کی جھلک
ہے غبارِ راہ سے ان کی جبینوں پر دمک

اُجڑے اُجڑے سے گریباں ویراں ویراں سے جمال
کوئلے سے لکھ دیئے کس نے ریاضی کے سوال
گیسوؤں میں گردشِ ایام کی سی اُلجھنیں
سانولے چہروں پہ صبح و شام کی سی اُلجھنیں

اپنے لٹکے آنچلوں سے بے خبر دھن میں رواں
ہوٹلوں کی بھٹیاں یہ چائے خانوں کا دُھواں
گھومتی رہتی ہیں دن بھر کوچہ و بازار میں !
ایک حصّہ یہ بھی ہیں دنیا کے کاروبار میں

اُن کے گرد و پیش لاکھوں داستانوں کے ہجوم
ان کے تیور بن سکیں گے کیا کبھی ماہ و نجوم
ان کے دامن میں کوئی موتی نہیں تارہ نہیں
ان کی قسمت میں شبستانوں کا نظارہ نہیں

شہر سے کچھ دُور ان کے جھونپڑے آباد ہیں
یہ لبِ تقدیر پہ ہنستی ہوئی فریاد ہیں
کانچ کی چوڑی سے ارزاں انکی عصمت کا نگیں
ان کے مذہب میں جہنم کا کوئی خطرہ نہیں

چل بصیرت کی عبا میں ایک تکمہ یہ بھی ٹانک
کارخانوں اور ملوں کے بند دروازوں میں جھانک
چند سِکّوں کے لیے ہے بنتِ صحرا کا وقار
اِن کے پہلو میں تصوّر اور خیالوں کے مزار

چار پیسے کی کھنک ان کے لیے پائل کا راگ
چھُپ کے ٹھنڈی آگ میں سوئے ہوئے ہیں انکے بھاگ
ملگجے ملبوس ان کے بے نیاز رنگ و نور
کوئلوں کا ڈھیر ہے ان کی جوانی کا غرور

اک شرارہ پھینک دو سارا الاؤ جل اُٹھے
اک ذرا گرمی سے آنکھیں ہی ملاؤ جل اُٹھے
شام کے ڈھلتے ہوئے سائے جدھر جاتے ہیں دوست
انکی تقدیروں کے مالک اسطرف آتے ہیں دوست

شکیلؔ بدایونی

غمِ عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے!
مُجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا کہ یہ دل نے بددُعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے!

نئی صُبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے!
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

✪

جو نقابِ رُخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے!

شکیلؔ بدایونی

مری زندگی ہے ظالم، ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

وہ اگر بُرا نہ مانیں، تو جہانِ رنگ و بُو میں!
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتہً پکارا

میں بتاؤں فرق ناصح، جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم، تری زندگی کنارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے !
وہی بات پوچھتے ہیں، جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیلؔ دیکھے، یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اُسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

عبدالمجید سالکؔ

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے!
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہونگے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہونگے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دَور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہونگے

کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹاتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہونگے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سُرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہونگے

شہزاد احمد

نہ سہی کچھ مگر اِتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتّھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو
تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

ظُلم کرتے ہو مگر اُف نہیں کرنے دیتے
تم سے اچھے کہ تڑپنے تو دیا کرتے تھے

ہم جو دستک کبھی دیتے تھے صبا کی مانند
آپ دروازۂ دل کھول دیا کرتے تھے

اب تو شہزادستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے!

حفیظ ہوشیارپوری

مجّبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اِک تیرا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے!
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی!
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

حفیظ ان سے میں جتنا بدگمان ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

ساحر لدھیانوی

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی!
از سرِ نو داستانِ شوق دھرائی گئی!

بِک گئے جب تیرے لب پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی

اے غمِ دُنیا! تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیّعت راہ پر لائی گئی!

ہم کریں ترکِ وفا اچھا چلو یونہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی!

دل کی دھڑکن میں توازن آ چلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

اُن کا غم اُن کا تصوّر، اُن کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل ہو گئیں آئی گئی

جرأتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی!

ساحرؔ لدھیانوی

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے

☆

ابھی زندہ ہوں، لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

☆

انہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

☆

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو
بہت دکھ سہہ لیا میں نے، بہت دن جی لیا میں نے

ساحرؔ لدھیانوی

تاج محل

تاج محل تیرے لیے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

میری محبوب پسِ پردہ تشہیرِ وفا!
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گنت لوگوں نے دُنیا میں محبّت کی ہے !
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار!
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں، کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں تیرے میرے اجداد کا خوں

میری محبُوب! انہیں بھی تو محبّت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل!
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل!

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل!
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر!
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

فیض احمد فیضؔ

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے !
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بیکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ گُل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اَب کے بہار گزری ہے

✪

یہ چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے!

فیض احمد فیضؔ

ہم تو مجبورِ وفا ہیں

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں

کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہو گا!
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

تیرے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے

کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

بلاکشانِ محبّت پہ جو ہُوا سو ہُوا !
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو، ہُوا سو ہُوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہُوا سو ہُوا !

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے !

تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم !
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

ناصرؔ

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دِل سے اُتر نہ جائے کہیں

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

نہ مِلا کر اداس لوگوں سے
حسُن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں!

جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصرؔ
پھر یہ دریا اُتر نہ جائے کہیں!

ناصر

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے

جس دُھوپ کی دِل میں ٹھنڈک تھی وہ دُھوپ اُسی کے ساتھ گئی
ان جلتی بلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے

وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اَوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے

اب شہر میں اس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں
ایوانِ غزل میں لفظوں کے گلدان سجاؤں کس کے لیے

مدّت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا،
ان خالی کمروں میں ناصرؔ اب شمع جلاؤں کس کے لیے

مصطفیٰ زیدی

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ دل، مرے رفیقو! غمِ رائیگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم، میرا ترجماں نہیں ہے!

کسی آنکھ کو صدا دو، کسی زلف کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انھی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ!
مِرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

منیرؔ

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اِک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا

چھلکائے ہوئے پھرنا خوشبو لبِ لعلیں کی
اِک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا

اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

سیف الدین سیفؔ

مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مرے آزمانے والے، مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں، وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا، دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھے اُسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر!
کبھی سر جھکا کے روئے کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شب غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے، کئی مسکرا کے روئے

خاطر غزنوی

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہُوا کچھ لوگ پہچانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے، اس گلی میں میرے افسانے گئے

یُوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دُھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں!
ہم جہاں پہنچے، ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اب بھی اُن یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے،
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

ادا بدایونی

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی، بر سرِ الزام ہی آئے

حیران ہیں لب بستہ ہیں، دلگیر ہیں غنچے!
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے

لمحاتِ مسرّت ہیں تصوّر سے گریزاں!
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

تاروں سے سجالیں گے رہِ شہرِ تمنّا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے

کیا راہ بدلنے کا گلہ ہم سفروں سے !!
جس رہ سے چلے تیرے درو بام ہی آئے

تھک ہار کے بیٹھے ہیں سرِ کوئے تمنّا
کام آئے تو پھر جذبۂ ناکام ہی آئے!

باقی نہ رہے ساکھ اَدا دشتِ جنوں کی!
دل میں اگر اندیشۂ انجام ہی آئے!

عندلیب شادابی

دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو

شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، بجلی، پھول
اس دامن میں کیا کیا کچھ ہے وہ دامن ہاتھ میں آئے تو

چاہت کے بدلے میں ہم تو بیچ دیں اپنی مرضی تک
کوئی ملے تو دل کا گاہک کوئی ہمیں اپنائے تو

کیوں یہ مہر انگیز تبسّم، مدِّ نظر جب کچھ بھی نہیں
ہائے کوئی انجان اگر اس دھوکے میں آجائے تو

سنی سنائی بات نہیں یہ اپنے اوپر بیتی ہے
پھول نکلتے ہیں شعلوں سے، چاہت آگ لگائے تو

جھوٹ ہے سب، تاریخ ہمیشہ اپنے کو دوہراتی ہے
اچھا! میرا خواب جوانی تھوڑا سا دوہرائے تو

نادانی اور مجبوری میں یارو کچھ تو فرق کرو
اک بے کس انسان کرے کیا ٹوٹ کے دل آجائے تو

کلیم عثمانی

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساس تنہائی بہت

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

منہ چھپا کر آستیں میں دیر تک روتے رہے
رات ڈھلتی چاندنی میں اس کی یاد آئی بہت

قطرہ قطرہ اشکِ غم آنکھوں سے آخر بہہ گئے
ہم نے پلکوں کی انہیں زنجیر پہنائی بہت

اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے اپنی ذات سے
ہم نے اس سے دل لگانے کی سزا پائی بہت

اب تو سیلِ درد تھم جائے، سکوں دل کو ملے
زخمِ دل میں آ چلی ہے اب تو گہرائی بہت

وہ سحر تاریکیوں میں آج بھی روپوش ہے
جس کے غم میں کھو چکے آنکھوں کی بینائی بہت

میں تو جھونکا تھا، اسیرِ دام کیا ہوتا کلیمؔ
اُس نے زلفوں کی مجھے زنجیر پہنائی بہت

اجمل نیازی

دل دریا میں کھوج ملا ہے کچھ آباد جزیروں کا
دریا کی تہہ میں پایا میں نے کشف تیری تصویروں کا

اِک معصوم سحر آئینہ فطرت کی تسخیروں کا
چڑیوں کی چہکار خلاصہ حمد کی سب تفسیروں کا

اِک مستی نا خفتہ آنکھ میں لا محدود زمانوں کا
ایک نشہ خوابوں سے پہلے خوابوں کی تعبیروں کا

یادوں کے اخلاص میں پنہاں راز جمیل جہانوں کا
خون کے نُور سے ظاہر ہوگا عہد نئی تقدیروں کا

اُس محبُوب صدا کے وصل سے میرے لفظ چمکتے ہیں
دیکھ ہوا کی آنکھ میں اجمل رقص میری تحریروں کا!

اُمید فاضلی

یادوں کی گھنی چھاؤں بھی رخصت ہوئی گھر سے
اِک اور سفر کے لیے لوٹ آؤ سفر سے

فطرت کا تقاضا ہے کہ فطرت کا ہو اظہار
خوشبو ہے تو لہرائے، جو بادل ہے تو برسے

بستی کا یہ عالم کہ نظر ابر کی جانب!
اور ابر کا یہ حال کہ دو بوند کو ترسے

جل اٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پہ سرِ شام
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

اتنا بھی کم احوال نہ سمجھے مجھے دُنیا
چھلکا ہوا اک حرف ہوں اس دیدۂ تر سے

اندر سے اصولوں کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ
بک جائیں تو دیکھو نہ تعجب کی نظر سے

حمایت علی شاعرؔ

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں بدل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کیجے کسی گم گشتہ جنّت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی سُن کے آوازِ جرس
پیش وپس سے بے خبر گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

اپنے سائے سائے سرنہوڑائے آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند، اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعر اُن کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

قمر جلالوی

کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں
غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے ہیں

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں

جاتی ہوئی میت دیکھ کے بھی اللہ تم اٹھ کر آ نہ سکے
دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں

بے وجہ نہ جانے کیوں ضد ہے انکو شب فرقت والوں سے
سنتے ہیں کہ شبنم کے قطرے پھولوں کو نکھارا کرتے ہیں

کچھ حسن و عشق میں فرق نہیں ہے تو فقط رسوائی کا
تم ہو کہ گوارا کر نہ سکے ہم ہیں کہ گوارا کرتے ہیں

تاروں کی بہاروں میں بھی قمرؔ تم افسردہ سے رہتے ہو
پھولوں کو تو دیکھو کانٹوں میں ہنس ہنس کے گزارا کرتے ہیں

قمر جلالوی

کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

چمن میں برق نہیں چھوڑتی کسی صورت
طرح طرح سے بناتا ہوں آشیانے کو

دُعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

چمن میں جانا تو صیّاد دیکھ بھال آنا!
اکیلا چھوڑ کے آیا ہوں آشیانے کو

مری لحد پہ پتنگوں کا خون ہوتا ہے
حضور شمع نہ لایا کریں جلانے کو

سُنا ہے غیر کی محفل میں تم نہ جاؤ گے
کہو تو آج سجالوں غریب خانے کو

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

اب آگے اس میں تمہارا بھی نام آئے گا
جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں فسانے کو

قمرؔ ذرا بھی نہیں تم کو خوفِ رُسوائی!
چلے ہو چاندنی شب میں انہیں بلانے کو

قمر جلالوی

مریضِ محبّت اُنھیں کا فسانہ سناتا رہا دم نکلتے نکلتے
مگر ذکر شامِ الم کا جب آیا چراغِ سحر بجھ گیا جلتے جلتے

انھیں خط میں لکھا تھا دل مضطرب ہے جواب اُن کا آیا نہ محبّت کرتے
تمہیں دل لگانے کو کس نے کہا تھا بہل جائے گا دل بہلتے بہلتے

مجھے اپنے دل کی تو پروا نہیں ہے مگر ڈر رہا ہوں کہ بچپن کی ضد ہے
کہیں پائے نازک میں موچ آ نہ جائے دِلِ سخت جاں مسلتے مسلتے

بھلا کوئی وعدہ خلافی کی حد ہے حساب اپنے دِل میں لگا کر تو سوچو
قیامت کا دن آ گیا رفتہ رفتہ ملاقات کا دن بدلتے بدلتے

ارادہ تھا ترکِ محبّت کا لیکن فریبِ تبسّم میں پھر آ گئے ہم !
ابھی کھا کے ٹھوکر سنبھلنے نہ پائے کہ پھر کھائی ٹھوکر سنبھلتے سنبھلتے

بس اب صبر کر رہروِ راہِ اُلفت کہ تیرے مقدر میں منزل نہیں ہے
اِدھر سامنے سر پہ شام آ رہی ہے اُدھر پاؤں تھک جائینگے چلتے چلتے

وہ مہمان میرے ہوئے بھی تو کب تک ہوئی شمع گُل اور نہ ڈوبے ستارے
قمرؔ اس قدر اُن کو جلدی تھی گھر کی کہ گھر چل دیئے چاندنی ڈھلتے ڈھلتے

احمد ندیم قاسمی

انداز ہُو بہُو تیری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

اس حُسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا

دِل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھُلیں
تو سامنے تھا، اور تصوّر خُدا کا تھا

چُھپ چُھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا

اٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھّر صدا کا تھا

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

قتیل شفائی

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی!
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی!
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیلؔ اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

شہرت بخاری

کب تک پھرو گے شہر میں یُوں دَر بدر چلو
سُورج غروب ہونے کو آیا ہے گھر چلو

ہونے کو ہے نزول بَلاؤں کا ، ہوشیار !
جھڑ جائیں پاؤں ٹوٹ کے چاہے ، مگر چلو

برپا ہے آسماں میں عجب آندھیوں کا شور
گُل ہو نہ جائے شمعِ خیالِ نظر ، چلو

اس گم فسردگی میں پڑے ہو مثالِ بُت
آواز دے رہی ہے اذانِ سحر ، چلو

یُوں ایڑیاں رگڑنے سے بستر میں فائدہ؟
مرنے کی ٹھان لی ہے تو پھر بام پر چلو

کیوں رُک گئے ہو، مڑ کے کسے دیکھتے ہو اب
یاں کب ملی کسی کو کسی کی خبر، چلو

پھر صُبح تک پڑے گا، گھنے جنگلوں سے کام
مسکن ہیں ڈانٹوں کے جہاں سربسر چلو

منزل کا نام لوگے تو کٹ جائے گی زباں
ٹھہری ہے ان دنوں یہی رسمِ سفر، چلو

شُہرت! غزل کی نعش اٹھائے کھڑے ہو کیا
مِل جائے گا کوئی نہ کوئی نوحہ گر، چلو

محسنؔ

بچھڑ کے مُجھ سے کبھی تُو نے یہ بھی سوچا ہے
اُدھورا چاند بھی کتنا اُداس لگتا ہے

یہ ختمِ وصل کا لمحہ ہے، رائیگاں نہ سمجھ
کہ اس کے بعد وہی دوریوں کا صحرا ہے

کچھ اَور دیر نہ جھڑنا اُداسیوں کے شجر
کسے خبر ترے سائے میں کون بیٹھا ہے؟

یہ رکھ رکھاؤ محبّت سکھا گئی اُس کو!
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے

میں کس طرح تجھے دیکھوں، نظر جھجکتی ہے
ترا بدن ہے کہ یہ آئینوں کا دریا ہے؟

کچھ اِس قدر بھی تو آساں نہیں ہے عشق ترا
یہ زہر دل میں اُتر کر ہی راس آتا ہے

میں تجھ کو پا کے بھی کھویا ہُوا سا رہتا ہوں
کبھی کبھی تو مجھے تو نے ٹھیک سمجھا ہے

مجھے خبر ہے کہ کیا ہے جدائیوں کا عذاب
کہ میں نے شاخ سے گل کو بچھڑتے دیکھا ہے

میں مُسکرا بھی پڑا ہوں تو کیوں خفا ہیں یہ لوگ
کہ پھُول ٹوٹی ہوئی قبر پر بھی کھِلتا ہے

اُسے گنوا کے میں زندہ ہوں اِس طرح محسنؔ
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

امجد اسلام امجد

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر سے
لیکن تری خُوشبو نہ گئی، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی، بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے

لرزا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چھُو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آکے پڑا ہے
پوچھے تو کوئی اس دِلِ شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص، پر اُس کو
پُوچھے تو کوئی اس دلِ شرمندہ سفر سے!

ہم رزقِ گزرگاہ تو خاشاک تھے، لیکن
وہ لوگ، جو نکلتے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے

ایسا تو نہیں، میری طرح سرِدِلب جُو!
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے

دن تھے کہ ہمیں شہرِ بدن تک کی خبر تھی!
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

امجدؔ نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

مجید امجد

کلبہ و ایواں

گھاس کی گٹھڑی کے نیچے وہ روشن روشن چہرہ
رُوپ، جو شاہی ایوانوں کے پھُولوں کو شرمائے

راہگزر پر سُوکھے پتّے چننے والی باہیں...،
باہیں جن کو دیکھ کے موجِ کوثر بل کھا جائے

بیلوں کے چھکڑوں کے پیچھے چلتے زخمی پاؤں
پاؤں، جن کی آہٹ سوئی تقدیروں کو جگائے

بھیک کے اک ٹکڑے کو ترستی کھوئی کھوئی آنکھیں
پلکیں، جن کے نیچے لاکھوں دُنیاؤں کے سائے

یہ زخمی رُوحیں، یہ دُکھتے دل، یہ جلتے سینے
کوئی انھیں سمجھائے جا کر کوئی انھیں تبلائے

تم اچھے ہو ان ہونٹوں سے جن کی خونیں سُرخی
محلوں کے سینوں کے اندر آگ لگاتی جائے

تم اچھے ہو ان زُلفوں سے، جن کی ظالم خُوشبو
پھولوں کی وادی میں ناگن بن کر ڈسنے آئے

تم خوش قسمت ہو ان آنکھوں سے جن کی تنویریں
سونے چاندی کے ایوانوں میں، مرگھٹ کے سائے

وہ چھپّر اچھے، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
اُن بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن بہری راتیں

مظفرؔ وارثی

مہک ملی ہے حرارت شکار کرنے سے
گلاب بن گیا شعلہ بھی پیار کرنے سے

پہن کے رنگ ہزاروں دکھائے رنگ اپنا
لگے وہ اور بھی سادہ سنگھار کرنے سے

شبِ فراق کو آبِ حیات پلوا دو!
طلب کی عمر بڑھے انتظار کرنے سے

مرے دکھوں نے مجھے قہقہوں میں دفنایا
مرا ہوں زندہ دلی اختیار کرنے سے

جو حلق تر کرے وہ ایک بوند ہے کافی!
بجھے نہ پیاس سمندر کو پار کرنے سے

مظفر اپنی اُڑانیں بھی ساتھ چھوڑ نہ دیں
ہوا کے بازوؤں پر انحصار کرنے سے

حفیظ جالندھری

ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سُن سکو اگر، قصۂ غم سنے گا کون!
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے

ایسا بھی کوئی نامہ بر! بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے، جا کے انہیں سنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آسکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اُس نے جلتی ہُوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

احمد فراز

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ !

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم درہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اب تک دِل خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ!

احمد فراز

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہوئے پھُول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہُوئے لوگوں میں وفا کے موتی!
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو!
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خُدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ ہیں، نہ وہ تُو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

خالد

رخصت ہُوا تو بات مری مان کر گیا
جو اُس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اِک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کر گیا

کتنی سُدھر گئی ہے جُدائی میں زندگی!
ہاں وہ جفا سے مجھ پہ تو احسان کر گیا

خالدؔ میں بات بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا

اظہر سہیل

سُورج نکل رہا ہے، شبِ غم گزر گئی!
"اُٹھیے، بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی"

تیری نگاہِ مست کا شِکوہ میں کیا کروں
خُود بے خبر رہی، مجھے بدنام کر گئی!

عرضِ نیاز و شوق، جہاں تھا وہیں رہا
کیسی شبِ وصال تھی، پل میں گزر گئی

تم سے شبِ فراق کی کلفت میں کیا کہوں
یہ جان لو کہ مُجھ پہ قیامت گزر گئی !

تاریک رات چھا گئی سارے جہان پر
شانے پہ تیری زلفِ سیہ جب بکھر گئی

مُجھ کو قلم کی شوخ نگاری سے ہے گِلہ
رُسوا کیا تجھے، مجھے بدنام کر گئی !

اظہر زبان بند ہے، بیٹھا ہوں لب سیئے
اور سوچتا ہوں طبع کی نُدرت کدھر گئی

شعیب بن عبدالعزیز

اے غمِ جاناں یہ کیا کارِ مسیحا کر دیا
دل جو لختِ سنگ تھا کِشتِ تمنا کر دیا

معجزے دکھلا گیا کیا کیا خیالِ حُسن بھی
برف کو شعلہ کیا، سُورج کو سایہ کر دیا

نُور لے کر اس رُخِ تاباں سے ہم نے مستعار
شب کی تاریکی کو جب چاہا اُجالا کر دیا

مَیں شعورِ ضبط کے آداب سے واقف تو تھا
اُن کی شانِ دلبری نے مجھ کو رُسوا کر دیا!

آئے ہو ہاں تم تو ساحل پر تماشا دیکھنے
بڑھ کے طوفاں نے جو ساحل کو بھی دریا کر دیا

جب کہیں افلاک میں بجلی نئی پیدا ہوئی
ہنس کے گردوں نے میری جانب اشارہ کر دیا
آئینے ہی آئینے ہیں جس طرف جاتا ہوں میں
اے مِرے ذوقِ تماشا تُو نے یہ کیا کر دیا!
مُجھ سے کُوزہ گر کو ذکرِ جامِ جم مرغوب ہے
اُن کا کیا اندازہ جن کو تُو نے خود سا کر دیا!

اس کے افسانے سے جی بھرتا نہیں حسن نے شعیبؔ
اک جھلک دکھلائی اور نیندوں کو عنقا کر دیا

یوسف مثالی

میں زندگی کی حدوں پہ ٹھہرا ہُوا یہ مدّت سے سوچتا ہوں
نہ کوئی رستہ نہ کوئی منزل عجب سفر پر نکل پڑا ہوں

نجانے کس وقت میری راہوں سے تیرے رستے الگ ہوئے تھے
مجھے تو سچ مچ خبر نہیں ہے، میں تجھ سے کیسے جُدا ہُوا ہوں

اُکھاڑ پھینکے ہیں ناشناسی کی آندھیوں نے درخت کتنے
زمیں میں گہری جڑیں تھیں میری، اسی لیے میں کھڑا ہُوا ہوں

تھکن سے ٹوٹے بدن کو سہلا رہے ہیں یادوں کے نرم جھونکے
کبھی کبھی یوں لگا ہے مجھکو، میں تیرے پہلو میں سو گیا ہوں

کسی میں تجھ سا نہ رنگ دیکھا، کسی میں پائی نہ تجھ سی خوشبو!
میں تیرے چہرے کے نقش پھر بھی ہر ایک چہرے میں ڈھونڈتا ہوں

رمق محبت کی میں نے اپنے لیے نہ پائی کسی کے دل میں
میں جس کو دُنیا میں بانٹتا ہوں اُسی خوشی کو ترس رہا ہوں

ستم تو یہ ہے کہ پھر بھی تجھ کو مری وفا پر یقیں نہیں ہے
میں تیری آنکھوں میں تیرتا ہوں میں تیری آنکھوں میں ڈوبتا ہوں

ترے بدن کے سمندروں سے اٹھا ہوں ہر پل میں ابر بن کر
میں جلترنگوں میں ڈھل کے یوسفؔ تری زمیں پر اتر رہا ہوں

مشتاق باسط

وہ گلابی پھول بھی جب آتشی سا ہو گیا!
میرا اپنا شہر بھی پھر اجنبی سا ہو گیا

میں تخیّل کے جہاں سے لوٹ کر آیا ہی تھا
میرا قد فوراً ہی گھٹ کر آدمی سا ہو گیا

تجھ سے بچھڑا تو مجھے ہونے لگا ادراکِ ذات
میرا لہجہ رفتہ رفتہ سرمدی سا ہو گیا

اپنے گرد و پیش کے ماحول کی کیا بات ہو
میرے اندر کا بھی موسم سرمئی سا ہو گیا

میرے ہی دم سے تری دُنیا میں تھیں سب رونقیں
تو بھی تنہا شہر کی اندھی گلی سا ہو گیا

سوچ کے پتھر کو باسطؔ شکل دی الفاظ کی
میرا فن شاعری بھی آزری سا ہو گیا

مشتاق باسط

اِس اجنبی سے شہر میں گھبرا گیا تھا کل
اُس کو قریب پا کے سکوں آ گیا تھا کل

نو عمر وہ جو پیار کی کوری کتاب تھا
مجھ کو جنوں کے راز بھی سمجھا گیا تھا کل

شاید یہ راستہ بھی مرا ساتھ چھوڑ دے
منزل کی سمت اسلئے تنہا گیا تھا کل

اُس سانولے سے حُسن کو میں دیکھتا رہا
بالوں میں اُس کے پھول بھی شرما گیا تھا کل

جس نے مرے وجود کے معنی بدل دیئے
وہ میری کائنات بھی مہکا گیا تھا کل

باسط انا کے خول سے باہر میں آگیا
پھر وسعتوں میں پھیلتا دیکھا گیا تھا کل

حبیب جالبؔ

وطن سے اُلفت ہے جُرم اپنا یہ جُرم تا زندگی کریں گے
ہے کس کی گردن پہ خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کریں گے

وطن پرستوں کو کہہ رہے ہو وطن کا دشمن، ڈرو خدا سے
جو آج ہم سے خطا ہوئی ہے یہی خطا کل سبھی کریں گے

وظیفہ خواروں سے کیا شکایت ہزار دیں شاہ کو دعائیں
مدار جن کا ہے نوکری پر وہ لوگ تو نوکری کریں گے

لیے جو پھرتے ہیں تمغۂ فن رہے ہیں جو ہمخیالِ رہزن
ہماری آزادیوں کے دشمن ہماری کیا رہبری کریں گے

نہ خوفِ زنداں نہ دار کا غم یہ بات دُہرا رہے ہیں پھر ہم
کہ آخری فیصلہ وہ ہوگا جو دس کروڑ آدمی کریں گے!

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چنوایا

دیوار کو آ توڑیں، بازار کو آ ڈھائیں
انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پہ نکل آئیں
مجبور کے سر پر ہے شاہی کا وہی سایا
بازار ہے اب تک وہ جس میں تجھے نچوایا

تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا
تائیدِ ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا
حق جس نے نہیں چھینا حق اس نے کہاں پایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

کٹیا میں تیرا پیچھا غربت نے نہیں چھوڑا
اور محل سرا میں بھی زردار نے دل توڑا
اُف تجھ پہ زمانے نے کیا کیا نہ ستم ڈھایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تُو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برسوں
سانچے میں ہر اک غم کے چپ چاپ ڈھلی برسوں
تجھ کو کبھی جلوایا تجھ کو کبھی گڑوایا!
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

✵

ثنا پبلیکیشنز
غزنی سٹریٹ ○ اُردو بازار ○ لاہور